نئے ادب کے معمار

از

عصمت چغتائی

کتب پبلشرز لمیٹڈ
بمبئی

سنہ ۱۹۴۸ء

قیمت

پندرہ آنے

فیروز مستری نے قادری پریس نور منزل محمد علی روڈ سے
چھپوا کر کتب پبلشرز لمیٹڈ ۱۷۔ گن بو اسٹریٹ بمبئی ۱ سے
شائع کیا

اسرارالحق مجاز

ایک بجی گھٹی شام تھی۔ لڑکیاں موسمی چھٹیاں گذارنے اپنے اپنے گھروں کو سدھار چکی تھیں۔ صرف چند چھوٹے نصیبوں والی جن کے گھر دور تھے یا کوئی ہم سفر نہ ملا تھا۔ ڈھنڈھار ہوسٹل میں سہمی ہوئی ابابیلوں کی طرح سرگرداں نظر آجاتی تھیں۔ لوگ سمجھتے ہیں یہ کالجوں کی آوارہ لڑکیاں بس دن رات عیش ہی کیا کرتی ہیں۔ کوئی انھیں کیسے بتائے کہ کالج کی حقیقی عیاشی اسی زمانہ میں ہوتی ہے جب کہ پڑھائی ہو رہی ہو، ورنہ بیے مصرف گذرنے والی چھٹیوں میں تو بورڈنگ میں بس پاگل خانے کا لطف آجاتا ہے۔

جب بدگویاں کرتے کرتے جبڑے دکھنے لگتے، اور ساری کہانیاں اور چٹکلے پھیکے پڑجاتے اور سارے سیاہ اور سفید جھوٹ سڑ بس کر جی متلانے لگتا، تو سوائے ہاتھی ڈباؤ چہار دیواری سے سر پھوڑنے کے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ دن تو کسی نہ کسی طرح زبردستی ہنسی کھیل میں گھسیٹ ڈالتے پر جلد ہی شام کا سرمئی سایہ صحن میں رینگنا شروع کرتا دم بولا اٹھتے اور نامعلوم سا دھیما دھیما

خوف گلا دبوچنے لگتا۔ چپکے چپکے گنتی کی آٹھ دس لڑکیاں ایک دوسرے کے قریب کھسک آتیں، گھروں کی یاد دل میں سلگ اٹھتی اور بے اختیار سر جوڑ کر آنسو بہانے شروع کر دیے جاتے۔ آنسو پونچھے جاتے اور پھر گھل مل کر جینے کی کوشش شروع ہو جاتی۔

جوں ہی شام پڑی سب کی سب کامن روم کی لمبی چوڑی دری گھسیٹ ٹینس کورٹ پہ لے آئیں اور تکیے چادریں لگا کر ایک عام خوابگاہ تیار ہو گئی، اور شروع ہو گئی گپ بازی۔

گھر نہ جا سکے تو کیا، ذکر ہی سے منہ میٹھا کرنے لگے۔ پر جوں جوں گھروں کی باتیں ہوئیں جی اور زیادہ بوجھل اور اداس ہوتے گئے، یہاں تک کہ گلے رندھ گئے اور خیالات کی ڈوریاں ڈھیلی پڑ گئیں۔ سب ہی کچھ نہ کچھ سوچ رہی تھیں۔

اور میں سوچ رہی تھی یہ چاندنی کس قدر مردہ ہے، یہ سارے صحن کے کونوں میں کتنے خاموش دبکے بیٹھے ہیں۔ جو یہ ایک دم سے جھپٹ پڑیں تو؟ اور یہ غیر مرئی پرچھائیاں سی جو دماغ میں سرسرا رہی ہیں۔ یہ اداسی کتنی بوجھل ہے، الّو کی آواز میں کیسی سنگدلی پوشیدہ ہے اور یہ ٹینس کورٹ پر لمبی لمبی لیٹی ہوئی لڑکیاں بالکل غمگین قبروں کی طرح معلوم ہو رہی ہیں۔ میں ایک بڑے سے بھیانک تابوت میں گھٹی ہوئی ہوں ...... آہ اماں نے مجھے گھر کیوں نہیں بلایا۔ انھیں مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں، تو کسی کو بھی مجھ سے محبت نہیں۔ اور کسی کو نہیں معلوم کہ میں کتنی اکیلی ہوں؟

اور سب لڑکیاں بھی یہی کچھ سوچ رہی تھیں۔ چار دن چھٹیوں کے گذر گئے چار اور گذر جائیں گے۔ پھر چار دن اور رہ جائیں گے اور یوں ہی یہ لمبے بیکار بے رنگ دن اور یہ تھکی تھکی شامیں یہ انتھک رینگتی ہوئی قطار! توبہ۔ نا امیدی اور غریب الوطنی کے احساس نے کچھ اس درجہ محبوس کیا کہ بے اختیار آہیں نکل گئیں۔

"اب کے گرمیوں میں ماموں ابا کے پاس چلی جاؤں گی"۔ اختر نے ترکیب سوچی،

"اور ہم تو پہاڑ پہ جایا ہی کرتے ہیں"۔ رضیہ نے اطلاع دی۔

"کلیان بڑی اچھی جگہ ہے"۔ عالیہ ہمیشہ اڑتی تھی۔

مگر محمودہ؟ کالی آنکھوں، کالے بالوں اور کالی رنگت والی محمودہ؟ اس کا کیا ہوگا۔ جس کا نہ کوئی گھر تھا اور نہ رشتہ دار۔ بورڈنگ ہی اس کا گھر تھا وہی لمبا چوڑا مقبرے کی طرح سنسان ہوسٹل، جہاں وہ چھٹیاں گذارا کرتی تھی۔ پھر گھٹن اور بڑھ گئی۔ خاموشی گہری ہوگئی۔ ایک خلا سی دلوں میں پھیلنے لگی اسی خلا میں آواز آئی۔

"اے غم دل کیا کروں......"

چونک کر جو ہم نے دیکھا تو یہ چاکلٹ جیسی سوندھی رنگت والی محمودہ تھی جو ہم سب سے دور دری کے کونے پر ہاتھوں کا تکیہ سر کے نیچے رکھے اپنی آنسو بھری آواز میں گنگنا رہی تھی۔

"....اے وحشت دل کیا کروں؟"

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال۔
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال۔
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

کچھ سوئی ہوئی لڑکیوں کے سپنے بکھر گئے۔ کلبلا کر اٹھ بیٹھیں۔ محمودہ کی آواز جذبات کی فراوانی سے اور سہم گئی ؎

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب

اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

پھر تو ستارے ٹوٹنے لگے، موتیوں کی لڑیاں ٹھیس سے بکھر کر دلوں میں الجھ گئیں، سینوں میں ہوکیں اٹھنے لگیں۔ لیکن جب شعلے بھڑک اٹھے پیمانے چھلک پڑے اور سینوں کے زخم مہک اٹھے تو ڈرامہ شاعری کی حدوں سے گذر کر بھونڈے قسم کی بھوں بھوں میں پھسل آیا۔ وہ دھوم دھام کی صفِ ماتم بچھی کہ محرم ماند پڑ گئے۔ سرور سے گذر کر ہلڑ بازی پر نوبت پہونچی۔ نہایت غیر شاعرانہ قسم کی ناک کی سُوں سُوں

از حد عامیانہ اور بچکانی ٹسر ٹسر، لاحول ولا قوۃ!

ایک ہنسی! پھر دوسری! اور سب کھل کھل کر لوٹ گئیں۔

توبہ! مگر غصہ تو محمودہ چڑیل پر آیا اور اصل غصہ آیا اس چھوٹی

سی کتاب پر جسے وہ آڑ میں چھپائے ہوئے تھی۔ چھاپہ مار کر کتاب کو قبضہ میں کرنا چاہا۔

"لو بھئی صفیہ اپنی کتاب" اس نے کتاب صفیہ پر کھینچ ماری، ایک کتاب کی دس بنتے بنتے رہ گئیں۔ جلدی جلدی لالٹین کی روشنی میں شاعر کا نام دیکھا۔

"ہائے قسے!" نفیس ناک والی انور بولی۔ "اسرار الحق!"

"چہ تو یہ کس قدر ڈھیل نام ہے"۔

"مگر مجاز؟ . . . ٹھیک ہی ہے"۔

"خاصہ ہے"۔

"چہ حد . . . . کافی سویٹ ہے جی"!

تو یہ تھی وہ کتاب جس کا نام تھا "آہنگ" جس نے ہمیں ایسے بڑے موقعہ پر بکڑ کر الو بنا دیا . . . . . بڑا جی کھسیانا ہوا۔ اور پھر لالٹینوں کی بتیاں اکسا اکسا کر وہ وہ غم دل کی پوچھ گچھ کی گئی کہ توبہ بھلی! ایسنلی سی کتاب ایک روپیہ قیمت۔ عیدی، بقر عیدی، نمائش کے پیسوں سے چھ چھ، سات سات کاپیاں خرید ڈالیں۔ تحفے ہیں تو "آہنگ" نقد ادھار، عاریتاً غرض سارے بورڈنگ میں "آہنگ" چل پڑی۔ جدھر دیکھیے چار لڑکیاں چمن کے کونے میں سر جوڑے کبھی "اندھیری رات کے مسافر" کے ساتھ دشت پیمائی کر رہی ہیں تو کبھی بر لبط شکستہ کے تار سلجھائے جا رہے ہیں۔ "دو نذر دل" لئے بیٹھی ہیں۔ نوچار "خانہ بدوش" کے ساتھ چند "رات اور ریل"

کے ساتھ فراٹے بھر رہی ہیں تو کوئی بھولی بھٹکی غمگین کسی کی یاد میں غرق منہ اوندھائے پڑی ہے۔ کسی طرف "انقلاب" لایا جا رہا ہے تو کہیں "غدار" پر پھٹکاریں پڑ رہی ہیں غرض دل و دماغ پر کچھ اس تان سے "آہنگ" چھائی کہ معلوم ہوتا تھا کوئی وبا بورڈنگ پر ٹوٹ پڑی ہے، یہاں تک کہ کان پک گئے سنتے سنتے، جی متلا اٹھے۔

"جی تو یہ ہے، تم تو مر جاؤ اس پر جا کر"
"پڑھنا وڑھنا چھوڑ دو جی، اس کے در پہ دھرنا دیدو جا کے"
"صفیہ سے کہو تمہاری شادی کرا دے"
"واہ تم نہ کر لو شادی"

کڑوے، کڑوے جلے چلتے۔ جی جل جاتے، اور منہ سوج جاتے۔

"یہ سب جنسی بھوک ہے۔ جہاں لڑکے کا نام سنا مر مٹیں"
ناک پر عینک لگائے ٹیچر صاحبہ بڑبڑائیں "ذہنی غلاظت"
یہ لیجئے مذاق ختم، جرم ثابت، مجرم سہم کر رہ گئے، ہونٹ ساکت ہو گئے مگر دل لرزاں۔ یہاں کمبخت شاعر سے جان نہ پہچان، سرو کار ہی کب تھا شاعری سے جو رشتہ قائم ہو چکا تھا وہ قائم رہا طعنوں تشنوں کی سنگ باری نہ توڑ سکی۔

اور جب اسی قسم کی اداس تنہائیاں بورڈنگ کی فضا کو گھیر لیتیں تو پھر غم دل ابھر آتا۔ محمودہ کی لرزتی ہوئی آواز ہوتی اور چمن کے خاموشی کونے، ایک دوسرے کے شانوں پر سر ٹک جاتے اور آنسوؤں کے بند کھل

جاتے۔ یہی معلوم ہوتا کہ شعروں میں اپنا ہی دل چیر کر رکھ دیا ہے۔ وہی جانے پہچانے دکھ، وہی پرانی آشنا الجھنیں۔ سب ہی کچھ تو تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اختر شیرانی کی سلمیٰ کی عمر کچھ ڈھل چکی تھی۔ حفیظ کچھ شاہی قسم کی شاعری پہ تلے ہوئے تھے۔ جگر مرنے کی بات کہتے تھے مگر کچھ پرانی وضع میں۔ رہ گئے جوش تو ان کی شاعری سے محظوظ ہونے سے زیادہ خوف آتا تھا۔ وہ ان کے دبنگ الفاظ۔ دبنگ خیالات، اور کچھ نادر شاہی قسم کے احکامات سن کر کچھ ہیبت بھی زیادہ طاری ہو جاتی تھی۔ مگر مجاز سے کچھ رشتہ داری سی محسوس ہونے لگی، جیسے ایک ہی قبیلے کے ہوں، بلکہ کچھ ایک ہی خاندان کے۔

پر نہ جانے کس کی نظر لگی کہ ڈوری کچھ ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی۔ سنا مجاز ریڈیو میں نوکر ہو گئے اور علی گڑھ بھر کی لڑکیوں کو سمیٹ سمیٹ کر تقریریں کروانے لیجایا کرتے ہیں۔

اور پھر سنا، نکال دئے گئے ریڈیو اسٹیشن سے!

پھر سنا، کچھ نہیں کرتے۔

پھر سنا کچھ بھی نہیں کرتے۔

اور پھر سنا اجی کچھ بھی تو نہیں کرتے!!!

نکھٹو!

جو کہیں نوکر نہ ہو یعنی مہینہ کے آخر میں مقررہ رقم بطور تنخواہ نہ لاتا ہو، اسے عرف عام میں نکھٹو کہتے ہیں۔ جی ہاں! آپ نے دیکھے ہیں یہ نکھٹو؟

ہندستان کے ہر متوسط طبقہ کے گھر کو جملہ خاندانی امراض مثلاً دمہ، دق، گٹھیا وغیرہ کی طرح یہ بھی لاحق ہو جاتے ہیں اور ہر جنگ سے پہلے اور جنگ کے بعد ان کی تعداد میں شدت سے اضافہ ہو جاتا ہے خدا جانے لفظ نکھٹو کو دیکھکر مجھے میاں مٹھو کیوں یاد آجاتے ہیں۔ جنھیں شوقین طبع لوگ پنجروں میں بٹھا کر ان سے کہتے ہیں میاں مٹھو "نبی جی بھیجو" اور میاں مٹھو گول گول آنکھیں گھما کر چونچ اوپر نیچے مٹکا کر فی البدیہہ نبی جی بھیج دیتے ہیں۔ مگر بعض کچھ ایسے کوڑھ مغز ہوتے ہیں کہ ہزار بھیجا مارو نبی جی بھیج کر نہیں دیتے۔ یہ نکھٹو کی صف میں آتے ہیں، آپ ان کے ساتھ خواہ کتنا بھی ریاض کیجیئے۔ کام نہ چلے گا۔ بہت کیا تو کلر کی وغیرہ کے اڈے پر اٹکا دئے گئے۔ تو "میاں مٹھو" کہہ کر رہ جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔

اف یہ لاچار پرندے، کاش کوئی ان کے پنجروں کی سلاخیں پگھلا دے اور ان سکڑے ہوئے بازوؤں کو ایکبار اپنی اڑان دکھانے دے مگر دیکھ بھال کر، فضا میں لاکھوں شکرے اور باز منڈلا رہے ہیں، ایسا نہ ہو کہ ایک ہی جھپٹے میں معاملہ صاف!

سب سے پہلے تو یہ ادبی شکرے ہیں۔ اگر چڑیا پھنس گئی تو اتنی ایڈیٹری کروائیں گے کہ قلم کی نوک کے ساتھ ساتھ انگلیوں کے پورے بھی گھس جائیں گے اور اتنا کوڑا لکھوائیں گے کہ کفن دفن کی ضرورت نہ رہے گی۔ اسی میں مغفرت ہو جائے گی۔

دوسرے ریڈیائی باز ہیں اگر ان کے ہتھے چڑھ گئے تو وہی گت ہوگی

جو قلندر کے ہاتھ میں بندر کی۔ وہ ادنگلے ہو نگے ناچ ناچیں گے کہ خدا کی پناہ ڈرامہ، ڈرامچہ، افسانہ، افسانچہ، نظم اور نظمچے اتنے لکھوائیں گے کہ انسان ایک دن خود ایک مستقل "چہ" بنکر رہ جائے گا۔ وہ سارے ملک میں انقلاب وارد کرنے کے دعوے، وہ خون کے طوفان اٹھانے کے اور سرخ آندھیاں چلانے کے رنگین ارادے، ڈرامچوں کی موٹی باریک آوازوں میں ڈوب جائیں گے اور تھوڑے دن بعد کام کی غیر دلچسپ نوعیت اور یکسانیت سے بدحواس ہو کر گھر سے لے کر اسٹوڈیو تک کے راستے کے علاوہ سب کچھ فراموش ہو جائے گا واسئے بر قسمت ادب اور آرٹ!

اگر غلطی سے کبھی اس پنجرے کی کھڑکی ڈھیلی پڑ گئی اور قلانچ لگائی تو نیچے فلمی خندق موجود ہے۔ یہاں پہونچ کر اپنی رہی سہی انقلابیت بوند بوند کر کے ٹپک جائے گی اور جو پھوک رہ جائے گا اسے کوئی پہچان بھی نہ سکے گا۔

لیکن جب مجاز ریڈیو سے نکلے تو انھیں کچھ عجیب قسم کی چیلیں جھپٹ سے گئیں۔ ایک طبقہ ہے ہندستان میں جو صرف کھانے اور پینے کی اہم خدمات انجام دیا کرتا ہے۔ عرف عام میں اس طبقہ کو کھاتا پیتا طبقہ کہتے ہیں۔ یہاں بڑے بڑے منچلے بھرے پڑے ہیں۔ اس طبقے کے نئے گھان نے باپ دادا کے آبائی پیشہ رنڈی بازی سے اکتا کر علم و ادب سے لطف لینا شروع کر دیا ہے اب ان کی محفل میں بجائے منی جان کے مجرے کے مشاعرے اور "ادبی جلسے" ہوتے ہیں۔ بجائے مرغ اور بٹیر کے ادیب اور شاعر پالے جاتے ہیں

خدا جانے مجاز کس رستہ سے پھنسے اور کس خوفناک پھٹکی میں پر اڑائے

اور اس پر مجھے ایک کہانی یاد آگئی۔

خاک اور دھول کی دنیا میں ایک پھول نے اپنا مغرور سر بلند کیا تو چمن مہک اٹھا۔ دیوتاؤں نے آسمان سے جھک کر اسے دیکھا اور اسے چن کر اپنے عظیم الشان باغ میں سجا دیا۔ ادھر سے آئی ننھی میٹھی آنکھوں والی پہیلیوں کی شہزادی!

"اے پھول تم کتنے حسین ہو" اس نے کہا اور پھول پنکھڑیاں پھیلا کر غبارہ بن گیا۔

"تو مجھے اپنے بالوں میں لگا لونا" پھول نے کہا

"نہیں میرے حسین پھول تم اسی طرح مہکتے جاؤ اور میں تمہیں دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتی رہوں گی" ننھی شہزادی نے اپنی میٹھی آنکھوں میں آنسو چھلکا کے

"دل چھپا سکتا ہوں پر آنکھیں چھپا سکتا ہوں میں" پھول نے بازو پھیلا دیئے۔

"شاعر اپنا دل اور آنکھیں سمیٹ لو۔ میرے قدم تو اطلس و کمخواب کے عادی ہیں اور میرے جوڑے میں لگانے کے لئے سونے کا پھول موجود ہے"

پھول کی ساری التجائیں بیکار گئیں۔

شہزادی کے جوڑے میں سونے کا پھول سورج جیسی آب و تاب سے جگمگا رہا۔ جس کی تمازت سے اس بیچارے خاکی پھول کی ساری پنکھڑیاں ایک ایک کر کے مرجھا گئیں اور پھر ٹوٹ کر بکھر گیا۔

جب دیوتا نے پھول کی اس بدنمائی کو دیکھا تو برا مان گئے وہ اسے

لائے تھے کھیلنے اور بہکنے کے لئے نہ یوں نخرے دکھانے کے لئے، اکتا کر وہ اسے واپس اجڑی ہوئی دھرتی کی گود میں ڈال گئے۔

کہانی ختم!

پر کون جانے اسی ننھی منی کہانی میں مجاز پہ کیا کچھ بیتی۔ پر تیز نگاہ سے کیا کچھ پوشیدہ رہ سکتا ہے۔ مجاز کا راز کوئی چھپا ڈھکا نہیں۔ اس کے زمانے کے ہر نوجوان کی زندگی کے آئینہ میں جھانکئے اور مجاز کو دیکھ لیجئے اس کے ہر دکھ میں مجاز کے دکھ کا راز مل جائے گا۔ پھر بھی خود مجاز نے جو دیکھا وہ "ارباب نشاط میں دکھا بھی دیا۔

بن گیا ننھا یک بیک فردوس کیف و انبساط
ایک دیرینہ کرم فرما کا ایوان نشاط

اور وہاں جب

بزم عشرت گوہ میں فردوس رعنائی لئے نظر آئے تو بے اختیار شاعر پر اپنی زندگی کا صحیح مصرف واضح ہو گیا۔ اور اس نے سوچا چلو اور کچھ نہیں پھر بھی اتنا تو سہارا ملا کہ ... ...

میرا نغمہ باعث دلداری خوباں تو ہے
میرا رونا خیر سے وجہ نشاط جاں تو ہے

اور اس سے زیادہ کی ہوس بھی بیکار، ویسے داد بھی ملی اور بے داد بھی مگر نہ اتنی جتنی آس باندھی تھی۔ محفل خوباں میں شاعر کو توجہ بھر کے ملی، پر وہ ناکارہ انسان جو اس کی پشت کے پیچھے چھپا ساتھ چلا آیا تھا۔ خالی ہاتھ

ٹرخا دیا گیا۔ شاعر نے "واہ" کی آرزو کی وہ مل گئی۔ انسان نے "آہ" کی تمنا کی وہ نہ ملی۔

اور جب انسان کی ہار ہوئی تو شاعر بھی کھسیا کر رہ پڑا۔

حلیہ

مجاز کی زندگی کی طرح ان کی صورت شکل بھی کچھ الجھی الجھی سی ہے لفظوں میں نقش و نگار کو ڈھالنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ہوا میں دائرے کھینچنے کی کوشش کرنا۔ تاثرات کی چہرے پر وہ ہما ہمی ہے کہ نقش و نگار کچھ سے کچھ بن کر رہ گئے ہیں آنکھیں تو ہیں مگر یہ اندازہ لگانا از حد مشکل ہے کہ ان کی تہہ میں کیا دبا ہوا ہے ایک مبہم سی یاس و ناامیدی، مگر ساتھ ساتھ کچھ بنانے کا ارمان، کچھ ڈھانے کا حوصلہ، کچھ الجھنیں اور پریشانیاں جو آجکل کے ہر نوجوان کا آبائی حق بن کر چمٹ گئی ہیں۔

اور ایک ناک جو ستواں کی حدوں سے کب کی گذر چکی ہے جس کی ہڈی شاید بڑھ رہی ہے اور چہرہ چھوٹا پڑتا جارہا ہے اور نہایت ڈرپوک قسم کا سہما ہوا دہانہ جو اپنے مالک کے سریع الحس اور جذباتی ہونے کا علمبردار ہے مجاز عجب قسم کا بزدل ہے۔ ویسے تو قلم کے بل بوتے پر وہ خون کی آندھیاں چلوا سکتا ہے۔ سرخ طوفان اٹھا سکتا ہے لیکن اگر آپ اس کے سامنے ایک ننھی سی چوہیا کی ٹانگ میں ڈورا باندھ کر کھردری سڑک پر گھسیٹیں تو وہ رو پڑے گا پچھلے دنوں جب ملک کی چیر پھاڑ کا جشن بڑی دھوم دھام سے سارے ملک میں منایا جانے لگا اور جیتے جیتے خون کی ہولی کھیلی گئی تو وہ دماغی طور پر سہم کر کونے میں دبک گیا۔ دنیا کو ایک رشتہ میں بندھا ہوا دیکھنے کی آرزومند آنکھوں

لے جب انسانی کھوپڑیاں سڑک پر پتھروں سے ناریل کی طرح پھوٹتی دیکھیں تو اس کی روح تک لرز اٹھی۔ وہ کئی گھنٹے بیہوش رہا اور دنوں منہ میں نوالہ نہ ڈال سکا۔

ناک نقشہ کے حساب سے ہاتھ پیر بھی ہیں۔ پر بال جی بھر کے ملے ہیں جن کے ایک کنارے پر کسی زمانے میں سفید کھدر کی ایک ٹوپی اس طرح معلق ہوا کرتی تھی کہ ہر وقت یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب گری! اور اب گری کم اور شاید غریب کہیں گر ہی پڑی اور ہمالیہ سے نکلنے والے "سرکش دھارے" کی لپیٹ میں آکر بہ گئی اور اس کی جگہ بالوں والی چائے پوشی سے ملتی جلتی کیپ نے لے لی لیکن وہ بھی کہیں لال پیلی آندھیاں اڑا لے گئیں اور آج کل جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہی ہوں مجاز کے سر پر کوئی شئے نہیں سوار ہے

ویسے میں مجاز کو بہت کم جانتی ہوں، میرا مطلب ہے میں اصل مجاز سے زیادہ انھیں ان کی شاعری میں ڈھونڈ کر پاتی رہی ہوں۔ بات یہ ہے کہ پہلے میری ملاقات ان کی شاعری سے ہوئی۔ اور پھر جب میں خود شاعر سے ملی تو میں نے انھیں وہی سمجھا جو اشعار نے بتایا تھا۔ میں نے مجاز کی شخصیت میں بھی اپنے زمانے کے تمام مجاز ہی دیکھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مجاز تنہا نہیں وہ اپنے وقت کے سارے دکھوں، الجھنوں، بندشوں اور رکاوٹوں کے خلاف پکارتا ہوا اٹھا، اور خوب اٹھا۔ پر نہ جانے منہ کے بل کیوں آرہا۔

جھوٹ سچ کا عذاب راوی کی گردن پر مگر سنتے ہیں کہ اڑان کے زمانہ میں کہیں ایسے بے موقعہ پھسل پڑے تھے کہ توبہ بھلی۔ یعنی کہیں بالکل شجر ممنوعہ قسم کی محبوبہ پر پھسل پڑے جو اپنی آبائی مجبوریوں کی باعث عشق کے میدان میں تو

اترہ آئی مگر بزنس کے معاملے میں رہ گئی۔

اور بھئی ہے بھی سچی بات کہ عشق تو اندھا ہوتا ہے، یہ قاضی اندھے نہیں ہونے جیسے۔ تو نہ جانے کیا بیتی۔ چہرے کی بجھی بجھی سی چنگاری بتاتی ہے کہ کچھ مزے کی نہیں بیتی۔ چہ، یہ نوجوان!

ویسے تو آسمان سے ستارے نوچ لائیں گے، اجی ایک نہیں سارے کے سارے، تخت سلطاں تو کیا سارا قصر سلطان پھونک دینے کی دھمکی دیں گے، یعنی کہ پورے تیس مار خاں، لیکن جو ذرا میدان عشق میں تنکا بھی لگ گیا تو چیت، فوراً لمبے لمبے لیٹ جائیں گے۔ اور کریں بھی کیا بیچارے صدیوں کی روائتیں اور فسانے یہی تو سکھاتے ہیں کہ دنیا میں عشق کے سوا اور سب فضول ہے، زندگی کا پہلا اور آخری مقصد یہی تو ہے کہ جھٹ پٹ موقع بے موقع کسی کے عشق میں مبتلا ہو جاؤ۔ اگر کامیاب ہوگئے تو سہرا باندھ کر گھوڑے پر چڑھو، پھر بھوکوں ننگوں کی تعداد بڑھانے پر ٹوٹ پڑو۔ اگر ناکام رہے تو پھر کیا فکر ہے۔ پاگل ہو جاؤ۔ مزے سے برسوں کا آزمودہ نسخہ ہے

خیر جی کون کہتا ہے عشق نہ کرو۔ جوانی اور محبت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے مگر آجکل کے نوجوان تو عشق بھی سلیقہ سے کرنا نہیں جانتے، پہلے زمانہ میں تو لوگ عشق کیا کرتے تھے اور بس کئے چلے جاتے تھے، یہ آجکل کے عاشق کچھ عجیب قسم کی معجون ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ مرض عشق ہی میں مبتلا ہیں یا اور ہزاروں روگ ہیں جنھیں عشق کی آڑ میں چھپا رکھا ہے۔ اور مجاز جو کہ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ہندستان کے اس درمیانہ طبقہ کے نوجوانوں کے نمائندے ہیں

جو زندگی کے سارے جھمیلوں بندشوں اور رکاوٹوں کا شکار ہوتے ہوئے بھی جی توڑ کر ان سے کشتم کشتا کر رہے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے یہ کانٹے چبھتے ہیں اور ان کی نوک پر وہ اپنا سینہ ٹیک دیتے ہیں۔ ذرا سوچئے یہ لوگ کیا جانیں سلیقہ سے عشق کرنا۔ کون جانے وہ عشق ہی تھا یا دنیاوی ڈھکوسلوں کے خلاف جہاد جو مجاز کے دل میں شعلہ بن کر بھڑکا۔ ہوش آتے ہی مورچہ بندی شروع ہوگئی ہوگی پہلی جنگ تو خود اپنے گھر کی گورنمنٹ سے، خود اپنے جائز حقوق کے لئے بھی بہنوں کو لڑ لڑ کر اسکول بھجوانا۔ ان کی شادیاں کہاں کیوں اور کیسے ہوتی ہیں۔ اس کا سوچ بچار کرنا۔ اگر اس ادنیٰ سے محاذ پر پیچھے ہٹنا پڑا تو یہ سمجھئے کہ آنے والی ساری فتوحات بھیانک شکستیں ہی نظر آئیں گی۔ بھلا جب اپنے ہی گھر میں جالے تنے ہوئے ہیں تو دوسروں کے گھر میں کس منہ سے جھاڑو لے کر جائیں۔ مگر خوش قسمتی سے مجاز کے والدین ان گنتی کے چند لوگوں میں سے ہیں جو منہ کا نوالہ روک کر بچوں کو تعلیم دلا دیتے ہیں

دوسرا محاذ کالج اور یونیورسٹی کے قوانین کے خلاف قائم ہوتا ہے جہاں آج جرمانہ تو کل رسٹیکیشن پر نوبت پہونچی ہوئی ہے۔ چال ڈھال پر بندش، بول چال پر بندش، کھانے پینے پر بندش۔ غرض ایک سہرے سے جینے پر بندش! اور جب زندگی میں یوں چاروں طرف سے ٹانگ گھسیٹی جا رہی ہو تو کوئی کیا تو عشق کرے اور کیا عاشقانہ شاعری، وہ زمانے تو لد گئے جب شاعر مزے سے عشق کرتے تھے، اور شاعری کرتے تھے، اور اب تو عشق کی گردن میں پولیس کا ڈنڈا لٹکا ہے، ہاتھ روٹی کمانے میں الجھے ہوئے ہیں،

پیرِ غلامی کی زنجیروں میں گھسٹ رہے ہیں۔ ایک نہیں سو ہزار آسیب جان کو چمٹے ہوئے ہیں اور حساس طبیعت ناک پر مکھی بٹھانے کو تیار نہیں۔ ایسی صورت میں شاعری بجائے داستانِ حسن و عشق کے اگر معجون مرکب نہ بن جائے تو اور کیا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مجاز کے یہاں عشق و سیاست باہم سموئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بھلا زندگی میں جب اتنی "مجبوریاں" ہوں تو کوئی کیونکر جیے۔ ایسی صورت میں

"کوئی نغمہ تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے"

پر ایسا ہوتا تو رونا ہی کاہے کا تھا بھلے ہی دن نہ تھے؟
ساز چھوڑنے پر کون تیار ہے۔ وہی مرنے کی ایک ٹانگ کہ

"لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری عادت نہیں"

پھر بھی مجبوریاں اور لاچاریاں ضدیں بن گئیں۔ چار دن کی ریڈیو کی نوکری ختم ہوگئی۔ منہ پر تمانچہ سا لگا۔

کیا کہوں کس شوق سے آیا تھا تیری بزم میں
چھوڑ کر خلد علیگڈھ کی ہزاروں محفلیں!

اور اب کہ۔ . . . .

"آہ تیرے میکدے سے بے پیے جاتا ہوں میں"

مگر چلتے چلتے باز نہیں آتے۔

"پھر تری بزم حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں"

ایسے ویسے نہیں بڑی دھوم دھام سے۔

"سر سے پا تک ایک خونیں راگ بن کر آؤں گا"

تو سمجھ میں نہیں آتا کہ مجاز کو واقعی سیدھا سادا عشق ہی ہوا تھا یا یہ بھی اس کا وہی خواب تھا جو آجکل کا بیشتر نوجوان سوتے جاگتے دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے۔ پر تعبیر نہیں ملتی۔ وہ گھر میں گوشت و پوست کی چاندسی دلہن ہی لانا چاہتا ہے۔ یا دنیا کو توڑ پھوڑ کر اپنی مرضی سے ڈھالنے کی خواہش کو دلہن کا روپ دیدیا ہے۔ اس کا عشق تو کچھ اس بری طرح اس دنیا اور اس کے نظام سے چپکا ہوا ہے کہ وہ اسے جدا ہی نہیں کر سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کوئی گھر بھی چاند سی دلہن کے پر نور مکھڑے کی دمک سے روشن نہیں ہو سکتا۔ جب تک ملک پر سے یہ بھیانک بیوگی نہ ہٹائی جائے گی۔ ایک ہی سانس میں وہ محبوب کے رخسار کی تابانیوں کے نغمے بھی گاتا ہے اور ان گھنگھور گھٹاؤں کا نوحہ بھی کرتا ہے جو اس کے رخ روشن پر چھائی ہوئی ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ چاروں طرف لٹکتے ہوئے وزنی تالے اس کی سانس گھونٹے دیتے ہیں۔ دانت پیس پیس کر وہ ان پر ہتھوڑے مارتا ہے۔

ایک چیز جو مجاز کے یہاں پائی جاتی ہے۔ وہ کسی دوسرے شاعر میں اتنی واضح اور ابھری ہوئی نہیں ہے۔ محبوب اور عورت کا تصور بے حد انوکھا اور اصول شاعری سے ہٹا ہوا ہے۔ پرانی شاعری میں محبوب حسن و جمال کی پوٹ ہوتا تھا۔ اس لئے اپنے چند مخصوص حربے ہوتے تھے اور چند انداز جو وہ وقتاً فوقتاً استعمال کرتا تھا۔ مگر اس کے سارے انداز نہایت اجنبی سے معلوم ہوتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آیا معشوق ہی کا ذکر ہے یا کسی جابر اور قہار شہنشاہ کا ذکر ہے۔ جیسے عشقیہ غزل میں سمو دیا گیا ہے۔ اور پھر میں سوچتی ہوں

کہ بھی یہ شاعر تو بڑے ترقی پسند ہوں گے۔ مگر بیچارے شہنشاہ کے خوف سے کچھ نہ کہہ پاتے ہوں گے پردل کی بھڑاس نکالنے کو معشوقاؤں کی آڑ میں سب کچھ کہہ گئے۔ غرض ان کے یہاں سوائے خوبصورت زبان اور تشبیہات کے انسانی حسن کہیں نظر نہیں آتا۔ مجاز وہ شاعر ہے۔ جس کی محبوبہ اسی دنیا کی عورت ہے۔

"میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے" اس دنیا کی عورت یہی جسے آپ چلتا پھرتا روز دیکھتے ہیں یہی نہیں مجاز نے عورت کو پہلی بار عورت نہیں کہا بلکہ اسے نکتہ داں بھی بنا دیا۔ حسن کے ساتھ ساتھ۔

مجھے حیران کر دیتی نکتہ دانیاں اس کی

اور بجائے خون دل پلانے اور لخت جگر کھلانے کے اچھی خاصی آدمیت کی باتیں کرتی ہے اور ....

رہے جب کہ یہ جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہے میرے اندیشے مٹائے ہیں

لیکن یہ کیا، کہ

کوئی میرے سوا اس کا نشاں پا ہی نہیں سکتا
جھلکتی ہیں میرے اشعار میں جولانیاں اس کی

لاحول ولاقوۃ! کہیں یہ سب کچھ مجاز کے شاعرانہ دماغ کا واہمہ تو نہیں اور یہ جیتی جاگتی عورت جسے میں اتنی اچھی طرح جانتی ہوں، کہیں اس کی یہ تمنا تو نہیں جسے وجود میں لانے کی آرزو میں یہ ساری جستجو ہے۔ جس کے بغیر خود اس کا وجود ادھورا اور حیران ہے۔ جس کے انتظار میں وہ اور اس کا وطن

غلامی کی بیڑیاں پہنے گھل رہے ہیں۔ جیسے وہ چیخ چیخ کر پکار رہا ہے کہ۔

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

مگر جی نہیں مانتا کہ یہ سب کچھ وہ اپنے تخیل سے کہہ رہا ہے۔ "نوجوان خاتون" ہیولیٰ نہیں۔ عورت ہے۔ جو شمع حرم یا گھر کی رونق ہی نہیں بلکہ ایک ساتھی ہے جو زندگی کی دوڑ میں کندھوں پر سوار نہیں بلکہ نصف بوجھ کاندھوں پر لئے قدم بہ قدم ساتھ ہے جس کا مقصد زندگی . . . "حجابوں میں جینا حجابوں میں مرنا" نہیں ہے

عام یقین ہے کہ اگر عورت گھر سے نکل کر کام کاج شروع کردے تو اس کی نسائیت اور حسن مارا جاتا ہے۔ وہ بالکل کاروباری اور غیر دلچسپ ہو جاتی ہے اس میں وہ نسوانیت اور لطافت نہیں رہتی۔ مجاز کی رائے میں حسین شئے خواہ باہر رکھو خواہ اندر حسین ہی رہے گی۔ بات یہ ہے کہ مجاز نے ایسی مثال بھی دیکھی ہے جہاں عورتیں تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ دنیا کے کاموں میں حصہ بھی لے رہی ہیں اور نسائیت سے بھی محروم نہیں ہوئیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ شروع شروع میں جو تعلیم کا اثر ہوا تھا وہ بہت کچھ اس مغالطہ میں ڈالنے والا تھا۔ جب عورتوں کے لئے تعلیم حاصل کرنا اور زندگی کا پیشہ اختیار کرنا ایک ہی درجہ کا جرم سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں جو لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں وہ اپنے آپ کو نہایت پاکباز اور مقدس ظاہر کرنے کے لئے بالکل ننوں کی سی زندگی گذارتی تھیں۔ لیکن اب جبکہ تعلیم نسواں کا مسئلہ حل ہی ہو چکا اور لڑکیاں آزادی سے تعلیم حاصل کر رہی ہیں، وہ بالکل غیر دلچسپ اور مردہ دل نہیں ہوتیں، اور نہ ہی ان کی نسوانیت وغیرہ غائب ہوتی ہے۔ وہ مختلف شعبوں میں کام کرتی ہیں اور

لوازمات زینت سے بھی غافل نہیں رہتیں۔ عشق و عاشقی کو بھی گنا ہ نہیں سمجھتیں باوجود کہنہ خیال لوگوں کی چیخ و پکار کے مجاز کے تخیل کی عورت نے دنیا میں قدم رکھ دیا ہے اور بڑھائے چل رہی ہے اور مجاز کی التجا کہ

سنانیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامان جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا

خالی نہیں گئی۔ عورت کو بھی احساس ہو رہا ہے کہ

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

مجھے تو تعجب ہے کہ جب مجاز نے پکارا کہ

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں

تو کسی نے لبیک نہ کہا۔ کسی نے اس کے بلاوے نہ سنے۔ اجی کون سنتا ہے، ان سب جھنکار نیولوں کو۔ کہنے والے کہتے ہیں ہندوستان میں لڑکیوں کی افراط ہے۔ ہو گی شاید مگر صرف شادی کے بازار میں۔ جہاں گرانی کے مارے ایسے ویسے کا گذر نہیں۔ مال پڑے گھنا کرتے ہیں۔ ادھر خالی جیبوں والے منہ تکتے ہیں یا پھر بلیک مارکٹ میں اڑن کھٹولوں پہ ٹکٹ لو اور ساتوں آسمان کی سیر کر آؤ۔

اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں

ویسے میں نے خود صنف نازک کو رونا روتے سنا ہے کہ مرد انھیں آزادی نہیں دیتے۔ اللہ جانے وہ آزادی کب ملے گی اور کون لا کر انھیں دے گا اور جب تک یوں ہی رونے روئے جائیں گے اور شاعر چیختے چیختے تھک جائیں گے

اس سپاہی کی طرح جس کا ایک ہاتھ آزاد ہو اور دوسرا پیٹھ کے پیچھے موڑ کر باندھ دیا گیا ہو اور یہ پیٹھ کے پیچھے مڑا ہوا زخمی ہاتھ اسی طرح لاچاری سے کراہتا رہے گا۔ کاش یہ ہاتھ اپنی انگلیوں کو ہلا کر دو چار گرہیں کھول دیتا۔ تو پھر بہت سی گرہیں آپ سے آپ سرکتی چلی جاتیں۔

میں نے مجازؔ کو بہت قریب سے نہیں دیکھا، اور دیکھا بھی صرف تین بار لیکن تینوں بار زندگی کے تین مختلف موڑ پر۔ پہلی بار ۱۹۳۶ء میں، یہ مجازؔ کے عروج کا پر شور زمانہ تھا۔ جب نئی پود نے "آہنگ" کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور سینے سے لگایا تھا۔ جب مجازؔ کے نام پر گرلز کالجوں میں لاٹریاں ڈالی جاتی تھیں۔ اور اس کے اشعار تکیوں کے نیچے چھپا کر آنسوؤں سے سینچے جاتے تھے اور جب کنواریاں اپنے آئندہ بیٹوں کے نام اسی کے نام پر رکھنے کی قسمیں کھاتی تھیں۔ نہ جانے کس ارمان کے بدلے میں؟ اس زمانہ میں مجازؔ سے ملنے میں اور صفیہ آپا کے ٹھونسے ٹھونسے بھرے کھیتوں میں اپنے گنے چھیلنے محمود صاحب کے یہاں پہونچے۔ ایک لق و دق کوٹ کے پھاٹک جیسے گریباں میں سے دو چنگاریاں سی کبھی کبھی چمک اٹھتی تھی، اور یہ مجازؔ تھے۔ حد سے زیادہ خاموش کم سخن کم نظر قسم کے انسان اور میں نے سوچا تھا کہ یہ شاعر سب گورکھ دھندا ہوتے ہیں۔ اندھیری رات میں ریل کی وہ جنون انگیز دوڑ کا خالق اتنا آہستہ رو چیونٹی جیسی چال، پر اب سوچتی ہوں کہ مجازؔ اگر کامیاب شاعر نہ ہوتے تو یقیناً ریل جیسی رفتار ہوتی۔ اصول کہتے ہیں کہ یا تو جسم دوڑے یا دماغ اور ابھی چند دن ہوئے، میں نے وہ نظم پھر سے پڑھی تو مجھے دور چٹانوں پر دندناتی ہوئی ریل صاف نظر آنے لگی۔ مع اپنی تمام گرج اور دھوم کے پر دیکھنے

ہی دیکھتے دہ فولادی ہیولی پگھل کر صرف خیال کی ایک مبہم سی پرچھائیں رہ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایسا معلوم ہوا یہ ریل نہ تھی بلکہ اس کی آڑ میں مجاز کی وہ شوریدہ سر روح تھی، وہ اس کا منچلا تصور جو طوفانی تیزی سے گرجتا ہوا بڑھتا چلا جاتا ہے

مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں،

بے اختیار میرے دماغ میں گونج گیا اور میں نے کچھ کچھ اس کی خودسری کا اندازہ لگایا۔ اوروں کو دوڑا کر، اپنے تخیل کی لگام ڈھیلی کرکے وہ اپنی قوت عمل کی بے تابیوں کو ٹھنڈا کر لیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے عمل کرنے والوں کے لئے، اور خود وہ؟ ساکت ہے بالکل خاموش پانی کی طرح ٹھیرا ہوا۔

جب محمود صاحب کے یہاں ملے تو بہت کم باتیں ہوئیں۔ صرف ایک مسئلہ پر چند سکنڈ بحث کی۔ میں نے کہا "آپ بڑے قدامت پرست ہیں۔" بولے کیوں؟"

میں نے کہا "نرس کی چارہ گری" میں آپ نے اس کا ثبوت دیا ہے کہ جب آپ نورا کے لبوں سے وہ لطیف شئے چرا لیتے ہیں تو آپ سمجھے تھے کہ زمانۂ قدیم کی معشوقاؤں کی طرح وہ شرما کر کچھ نخرہ کرے گی، بگڑے گی۔ پر جب وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تو آپ کو وہ بے حیا معلوم دی کیونکہ شمع حیا جسے آپ کی قدامت پرستی نے روشن رہنے دیا ہے۔ وہ جھلملا کر رہ گئی۔

بولے "شاید ایسا ہو مگر شرمانے میں لازم نہیں کہ قدامت پسندی کا خدشہ ہو۔"

میں نے کہا "شرمانے میں کوئی نقصان نہیں، پر جب اسے قدرتی طور

پر شرم نہیں آئی تھی اور صرف آپ کی خاطر سے وہ شرما دیتی تو . . . . یہ تو "

" لاحول ولا قوۃ " مکدر ہو کر بولے " یہ تو میں کبھی نہیں چاہتا تھا "

اس کے بعد سب نے ہنسنا شروع کر دیا، لہذا بات ادھوری رہ گئی۔ اس کے بعد مجھے اور صفیہ کو پہونچانے مجاز اور محمود صاحب لالٹین لے کر آئے پھاٹک پہ مذاق فرمانے لگے کہ "بھئی کسی روز ہمیں بھی مدعو کیجئے"

ہم نے کہا "بڑے شوق سے مگر سر پر تو ا باندھ کر آئیے گا چوکیدار کی لاٹھی میں لوہے کی شام لگی ہے"

بولے " یہ پہرہ آپ لوگوں پر کب تک رہے گا "

جب تک آپ لوگ چاہیں "

" ہم لوگ " محمود صاحب بھی بگڑے ۔

" غلطی ہوئی، آپ لوگ سے میرا مطلب ہے آپ کے قبیلے کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو ہمارے چال چلن کا پہرے دار سمجھتے ہیں "

" تو ان سے لڑئیے " مجاز نے کہا ۔

" ابھی نہیں ۔ بوقت فرصت انشاء اللہ " ہم نے جواب دیا اور پھاٹک کے اندر غڑاپ ہو گئے ۔

اور پھر چار پانچ سال گذر گئے ۔ کبھی کبھی اڑتی اڑاتی خبریں ملتی رہیں پھر ۱۹۴۷ء میں اچانک ریڈیو اسٹیشن پہ ملے ۔ یہ وہ زمانہ تھا مجاز کا ستارہ شاعری ڈوب چکا تھا ۔ کچھ کچھ متقدمین کی صف کی طرف کھسکنا شروع کر دیا تھا ۔ وہ تو کھو اثاثہ اتنا جمع ہو چکا تھا کہ کچھ نہ کچھ پاؤں جمے رہے ورنہ اگر پشت پہ آہنگ

نہ ہوتی تو کبھی کے ختم تھے۔

ریڈیو اسٹیشن پر کوئی مشاعرہ تھا۔ ہم لوگ بھی اتفاق سے پہونچ گئے، تمام شعرا، تو موجود پر آپ نہ جانے کہاں غائب اشاروں سے پوچھ گچھ ہوئی تو منتظمین نے اشارے سے بتایا نے کر رہے ہیں۔ توبہ!

شکر ہے کہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے لوگ آپ کو سمیٹ لائے اور کرسی پر ٹکا دیا۔ اب حلیہ ملاحظہ ہو۔ میلا چست پاجامہ کان میلیوں جیسا اس پہ بے تکا سا اور کوٹ گلے میں جیکٹ مفلر اور سر پہ جانے پوشتی۔ واہ!

مائکروفون پہ آکر نہ جانے کیا اول فول بکنے لگے۔ کلیجے میں آب آتش لاوے کی طرح کھول رہا تھا آنکھوں کی پتلیوں کو قرار نہ تھا۔ ایک زمین پر تو دوسری آسمان پر۔ کبھی ایک دائیں تو دوسری بائیں کرنے میں۔ ایک ہاتھ مشین کی سی رفتار سے بالوں کی ایک ریت الودہ لٹ کو بار بار کنپٹی پر سے اٹھائے جا رہا تھا اور وہ بے حیائی سے گرے جا رہی تھی۔ اب خوش الحانی شروع۔ اللہ جانے کیا اور کیوں بکنا شروع کیا بیچ بیچ میں دانت بھینچ کر نہ جانے کیا کیا کچھ بھی دیتے جانے ٹھلتے ہوئے مائکروفون سے دور نکل گئے۔ واپس لانے پر بگڑ کر بیٹھ گئے۔

"یہ ان کے منہ کو کیا ہو گیا، کیا داڑھ میں درد ہے"، میں نے شاہد سے پوچھا۔

"نہیں تو، یہ تو ہمیشہ سے ہے، اس کے جبڑے میں" وہ بولے۔

"کوئی نہیں، پہلے تو کبھی بھی نہیں تھا" میں نے برا مان کر کہا اور مجھے کسی طرح یقین نہ آیا کہ مجاز کا جبڑا ہمیشہ سے ایسا ہی ہے یقیناً وہ مجھے جلانے کیلئے بن رہا ہے اور اس دن خوب ہی تو جی جلا۔ جب باہر آئے ہم لوگ تو آپ سے

پھر مڈبھیڑ ہوگئی۔ آپ جو باتوں کا تو تار بندھا ہے تو اللہ توبہ! وہ طویل طویل جملے جو ختم ہی نہ ہوں اور ایک میں دوسرا جڑتا ہی چلا جائے۔ مجھے شراب پیئے ہوئے ہو کوئی تو ویسے بھی ذرا وحشت ہوتی ہے کہ نہ جانے کب دھول مار دے۔ کیونکہ یہی رائے سنی ہے۔ ہمیشہ سے ان لوگوں کے بارے میں۔ اور آپ ہیں کہ معلوم ہوتا ہے جوار کی بوری کا منہ کھل گیا اور بھر بھر کے دانے نکل رہے ہیں۔ کیا مجال جو مہلت ملے اور کہہ سکیں کہ دلی شہر میں تانگے مشکل سے ملتے ہیں۔ اور رات کے گیارہ بجے ہیں، اب تو بخشئے ۔

خیر خود ہی کچھ دل میں نیکی آگئی۔" بولے صبح آؤں گا"

ایک تو مشاعرہ ہی کچھ بودا تھا دوسرے مجاز کی بدحواسیاں۔ جی متلا گیا اس رات دیر تک ہم مجاز کا ذکر خیر کرتے رہے پھر فاتحہ پڑھکر سوگئے۔

اور صبح ہی صبح کوئی چھ بجے ہوں گے کہ آپ وارد! اور کیسے کہ پہلے سے بھی زیادہ لب ریز۔ رات والی جوار کی بوری میں معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت تک دانے پس گئے ہیں اور منہ سے باتیں ایسے نکل رہی ہیں جیسے کسی نے سوکھے ستو گالوں میں بھر لیئے ہوں اور چولھا پھونکنے کی مشق کرنا چاہتا ہے۔ جبڑا اور بھی بھنچ گیا تھا۔

باتوں کے معاملہ میں آپ مجاز کو حد سے زیادہ بے تکا پائیں گے۔ کبھی آپ ملیں گے تو نہایت ہر بات کا جواب یک لفظی، آپ گھنٹہ بھر بیٹھا کیجے کیا مجال جو کوئی انچ بھر سے زیادہ لمبا جملہ ہونٹوں کے پار ہوسکے۔ لیکن کسی دوسرے وقت آپ ملیں گے تو مجاز کے سوا نہ کسی سے بات کر سکیں گے۔ اور نہ کسی کی سن سکیں گے ملتے ہی

فوراً آپ کے منہ پر تالا ڈال کر کانوں کو گرفتار کرلیں گے۔ اب خواہ آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ وہ خود ہر سوال کا موزوں جواب دیتے چلے جائیں گے۔ یہ حالت انہیں اس وقت طاری ہوتی ہے۔ جب دریا دل سے بحر معرفت میں غوطہ لگا چکے ہوں یہ بڑی دوسری ملاقات بدقسمتی سے کچھ ایسی ہی حالت میں ہوئی باتوں کے آبشار پوری طاقت سے چھوٹ پڑے۔ بولتے بولتے گلے میں پھندا سا پڑا معافی مانگ کر بولے" ذرا گلا کچھ خشک ہو رہا ہے" پھر جیب سے ایک بوتل نکال۔

"کوئی ایسی ویسی چیز نہیں، عرق گلاب ہے ذرا گلا خستہ کرلوں" دو گھونٹ لئے کاگ لگایا اور جیب میں واپس۔

"ہاں تو پھر . . . . "

پھر ریل گاڑی اپنی پوری رفتار سے چل پڑی، اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ ریل نہیں مجاز کی زبان ہے جو چل رہی ہے ؎

اک رخش بے عنان کی برق رفتاری کے ساتھ

خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی

اس شعر کو پڑھ کر ہمیشہ مجھے ایسا محسوس ہوا کرتا تھا گویا کوئی جملہ احساسات کو طوفان میل کی رفتار سے دوڑا رہا ہے۔ جذبات ریل کی جھپٹ کے ساتھ اڑنے لگے ہیں اور دماغ زقندیں بھر رہا ہے اور میرا جی چاہا مجاز کا منہ کوئی بند کردے تاکہ یہ لا ادالیوں بکواس بن کر ضائع ہونے سے بچ جائے۔ مگر بوتل میں کاگ تو جب ہی لگایا جا سکتا ہے۔ جب کہ وہ ثابت و سالم ہو، اگر چکنا چور ہو چکی ہو تو الٹا ہاتھ کٹ جائے گا۔

تو کوئی کھلے ہوئے منہ کو نہ بند کر سکا۔ اور موتی یوں ہی رُلتے رہے۔ میں نے
موتی اس لئے کہا کہ مجاز کی زبان نہایت پاکیزہ اور ستھری ہوئی ہے۔ عام طور
پر بات کرنے میں ترشے ہوئے نپے تلے ذو معنی جملہ بے تکان بنتے چلے جاتے ہیں مجاز
کی زبان کی دھار تو کچھ جوش کی صحبت ہی میں خوب چمکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے
پینچ سے لڑ رہے ہیں اور پھر مزہ یہ کہ جملے نہایت ہی مختصر مگر دو دھارے ہوتے
ہیں جو کاٹتے ہیں۔ پر الجھتے کہیں نہیں۔

میں نے یہ غلط کہا تھا کہ مجاز بحر معرفت میں غوطہ لگانے کے عادی
ہیں، در اصل میرا مطلب تھا وہ شراب پیتے ہیں اور حماقت کی حد تک پیتے
ہیں۔ پیتے وقت صرف ایک بات کا خیال رہتا ہے کہ جلد از جلد پئیں اور بہت
سی پی لیں تاکہ دوسروں سے زیادہ حصہ میں، جس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے
کہ حالت خراب ہو جاتی ہے، وقتی طور پر تو کچھ نہیں۔ بعد میں یہ آگ کی بارش
جب متواتر معدے اور جگر پر ہوتی ہے تو صحت کا تو کوئی سوال ہی ایک سرے
سے نہیں رہتا۔ شاید یہی وہ سب سے شدید مرض ہے جو جان کو لاگو ہے، جس نے
جسم کو کھوکھلا کر دیا ہے اور دماغ پژمردہ ہو گیا ہے۔ ایک تو کڑوا کریلا اوپر سے
چڑھا نیم بالکل ہڈیوں اور کھال کا معاملہ باقی ہے

تو یہ دوسری ملاقات نے رہی سہی دلچسپی بھی ختم کر دی سنی سنائی پر
ٹال بھی سکتے تھے پر چشم دید حالت پر تو خلوص دل سے فاتحہ پڑھنے کا حق حاصل ہو گیا
خدا خدا کر کے چائے آگئی اور باتوں کے بہاؤ میں کچھ کمی ہوئی۔ ادھر سے
بھی دو چار سوالات کئے گئے کہ کبھی اتنے سویرے کیسے آگئے۔ جواب ملا کہ ریڈیو اسٹیشن

سے تانگہ لے کر اس وقت سے جو چلے تو صبح تک شہر میں چکر لگا رہے تھے، تانگہ والے سے کہہ دیا تھا کہ بھیا تیرا جی چاہے جہاں لے چل۔ بیچ میں دو چار جگہ لوگوں کو جگا جگا کر شرف ملاقات بھی بخشتے آ رہے تھے۔

پھر کچھ موڈ میں آگئے اور نظم سنانا شروع کی۔ بیچ بیچ میں اتنی باتیں کرتے گئے کہ جی جل گیا۔ دھوپ نکلتے نکلتے کچھ روپ رنگ اترنا شروع ہوا تو کچھ خاموش ہو گئے۔ پھر ہم لوگ ہار گئے تو اتر کر راستہ میں کسی کتب فروش سے اتنی دیر باتیں کیں کہ مجبوراً انھیں چھوڑ کر جانا پڑا

اس کے بعد عرصہ تک کوئی خبر نہ ملی اور نہ ہی کچھ زیادہ ڈھونڈی گئی کہ کچھ ماہ ہوئے سنا کہ منجھلے انھیں بمبئی سمیٹ لائے ہیں۔ یہ بھی برا نہ ہوا۔ کون جانے شاید اب بھی بین بٹور کر کام چلایا جا سکے۔ اور اب تیسری دفعہ جب ملی تو دیکھا کہ کچھ صورت ہی دوسری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں طوفان اور ریلے گذر گئے ہیں جو چہرے کے سارے احساسات اور جذبات اڑا کر لے گئے۔ جیسے دبہ شخص کچھ سنتا ہے اور نہ سوچتا ہے اور نہ ہی آئندہ اس قسم کی حماقت کا کوئی ارادہ رکھتا ہے۔ کسی شدید بیماری کے حملے نے بالکل سن کر ڈالا ہے، چہرہ کو غور سے دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ شاید اس شخص کو خبر ہی نہیں کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا آنکھوں میں ایک غائبانہ تغافل جیسے کسی کو پہچانتے ہی نہیں۔ ایک بار نہیں کئی بار مختلف گروہوں میں دیکھا، اسی طرح غیر حاضر قسم کا وجود کھانے والوں کے ساتھ کھا لینا۔ چلنے دیکھ کر چل پڑنا بیٹھے دیکھ کر بیٹھ جانا اور رخصت ہوتے دیکھ کر ان کے پیچھے پیچھے سرک جانا۔ عدم اور وجود کچھ ایک ہی جیسا۔ جسم تو

موجود ہے۔ مگر آگے سراغ نہیں ملتا کہ ود حضرت واقعات کہاں بھٹک رہے ہیں
مشاعروں میں کھڑا کر دیا تو ہاتھ سوکھے پتوں کی طرح آواز گویا کوسوں دور سے گرتی
پڑتی چلی آرہی ہے۔ داد دیتے جی ڈرتا ہے کہ کہیں سچ مچ اسٹیج سے نیچے نہ گر پڑیں
مگر قسمت سے ساتھی کچھ ایسے بے ڈھب مل گئے ہیں جو انھیں کانچ کے
گلاس کی طرح اٹھائے پھرتے ہیں۔ مگر واہ رے دم خم جوں ہی موقع مل جاتا ہے یہ کانچ
کے گلاس صاحب فوراً چٹان سے سر دے مارتے ہیں۔

لوگوں نے رائے دی کہ پیسے کماؤ پیسے، اللہ نے چاہا تو سارے روگ
دور ہو جائیں گے۔ آپ نے دو چار فلمی گانے لکھ پیسے کما ڈالے اور فوراً اللہ
شافی کر گئے، نوبت بہ اینجا رسید کہ ڈر لگنے لگا کہ اگر فراغت ہوئی تو تنگی اور
بڑھ جائے گی۔

لیکن حال ہی میں کچھ دنوں سے مجاز کو شاید یقین ہو گیا ہے کہ وہ چند
خدائی فوجدار قسم کے لوگوں میں آن پھنسے ہیں جو انھیں یوں سستے داموں کھونے کو
تیار نہیں ہوں گے، پہلے تو جناب کچھ جز بز ہوئے اور دھمکی دی کہ اگر لوگوں نے پیچھا
نہ چھوڑا تو چلے جائیں گے۔ واپسی پر اب کچھ ہاتھ ڈھیلے کر رہے ہیں اور وہ لوگ
ڈھٹائی کی حد تک پہونچی ہوئی کوششوں سے انھیں گھسیٹ کر اس خود فراموشی
کے غار میں سے واپس نکال رہے ہیں جس میں ڈوبنے پر وہ مصر ہیں اور اب تو خدشہ
ہو چلا ہے کہ وہ انھیں کھینچ ہی لائیں گے۔

یہی وجہ ہے شاید، جو اب کبھی مجاز کہیں ملتے ہیں تو لوگوں کو ایسے دیکھتے
ہیں گویا کہہ رہے ہیں کہ "ہاں ہاں، کچھ یاد تو پڑتا ہے کہیں دیکھا ضرور ہے۔"

اور وہ مہمانوں جیسا سایہ چپکے سے سرکتا جا رہا ہے۔ وہ علی گڈھ لکھنؤ کی پر لطف صحبتیں جو افسانہ بنتی جا رہی تھیں پھر کچھ کچھ زندہ ہو رہی ہیں۔ ایک ہلکی سی پھریری تولی ہے۔ اب دیکھنا ہے جان کب پڑتی ہے۔

ویسے تو مجاز نے ایک پتلی سی کتاب مکمل کر کے، ادب اور شاعری کو اتنا لکھ دے دیا ہے کہ بہنے ان کا نام چوٹی کے شعرا میں بڑی آسانی سے شمار کر لیا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ وہ ساری عمر اس کا تکیہ لگائے مزے سے بیٹھے رہیں۔ اگر وہ چاہیں تو بھی نہیں کر سکتے۔ یہ قیامت جیسے طوفان بھرے زمانہ میں اگر وہ لمبی تان کر سونا چاہیں تو آنکھیں پہلے ہی بند رہیں نیند نہ آئے گی۔ دنیا تو اس تیزی سے قلابازیاں کھا رہی ہے، ایسے وقت میں یہ چپ کا روزہ کب تک؟

. . . .

نہ جانے میں نے کیا کچھ لکھ ڈالا۔ شاید کوئی بات مجاز کو ناگوار گزرے،

مگر سنا ہے مجاز کو اگر کوئی بات بری لگے تو وہ خاموش خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔ منہ سے تو کچھ نہیں کہتے۔ خیر مجھے کوئی پرواہ نہیں، اگر کوئی بات انھیں بری لگے تو شوق سے لگ کرے بلکہ میں تو چاہتی ہوں کہ کوئی بات انھیں ایسی بری لگے کہ وہ بھنّا اٹھیں، اور ان کا قلم برس پڑے اور مجھے یقین ہے کہ اس بار جو کچھ ان کے قلم سے ٹپکے گا، آہنگ سے بھی بلند ہوگا۔ کیونکہ آج کے مجاز میں

اور دس برس پہلے کے بجا آزمیں زمیں اور آسمان کا فرق ہے۔ وہ ایک جوشیلا باغی لڑکا تھا اور اب جگت ہوا جھیلا ہوا مرد ہے۔ وہ ایک دوڑتا اچھلتا آبشار تھا۔ اور یہ ایک بند باندھا ہوا دیا۔

دیکھنا ہے یہ بند کب ٹوٹتا ہے

انتخاب

آوارہ

اندھیری رات کا مسافر

اعتراف

خوابِ سحر

دو غزلیں

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارا پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے دل کا حال
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ، جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر چلتی ہوئی شمشیر سی
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رُک کے دم لوں یہ مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لئے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لئے
پر مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لئے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں ٹھانی ہے کہ اب عہد وفا بھی توڑ دوں
ان کو پا سکتا ہوں میں یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے یہ زنجیرِ ہوا بھی توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں، اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

"بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں، اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں"
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

اتنی تو کم سے کم ہو مری جراتیں بلند
شاہی کو آج صرف اشاروں سے چھین لو!

ماہرالقادری

اندھیری رات کا مسافر

جوانی کی اندھیری رات ہے ظلمت کا طوفاں ہے
مری راہوں سے نورِ ماہ و انجم تک گریزاں ہے
خدا سویا ہوا ہے، اہر من محشر بداماں ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں !
غم و حرماں کی یورش ہے مصائب کی گھٹائیں ہیں

جنوں کی فتنہ خیزی حسن کی خونیں ادائیں ہیں
بڑی پرزور آندھی ہے، بڑی کافر بلائیں ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
فضا میں موت کے تاریک سائے تھرتھراتے ہیں
ہوا کے سرد جھونکے قلب پر خنجر چلاتے ہیں
گزشتہ عشرتوں کے خواب آئینہ دکھاتے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
زمیں چیں بر جبیں ہے آسماں تخریب پر مائل
رفیقانِ سفر میں کوئی بسمل ہے کوئی گھائل
تعاقب میں لٹیرے ہیں، چٹانیں راہ میں حائل
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
افق پر زندگی کے لشکرِ ظلمت کا ڈیرا ہے

حوادث کے قیامت خیز طوفانوں نے گھیرا ہے
جہاں تک دیکھ سکتا ہوں اندھیرا ہی اندھیرا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
چراغِ دیر، فانوسِ حرم، قندیلِ رہبانی
یہ سب ہیں مدتوں سے بے نیازِ نورِ عرفانی
نہ ناقوس برہمن ہے، نہ آہنگِ حدی خوانی
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
تلاطم خیز دریا، آگ کے میدان حائل ہیں
گرجتی آندھیاں، بپھرے ہوئے طوفان حائل ہیں
تباہی کے فرشتے جبر کے شیطان حائل ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
فضا میں شعلہ افشاں دیوِ استبداد کا خنجر

سیاست کی سنانیں اہلِ زر کے خونچکاں تیور!
فریبِ بیخودی دیتے ہوئے بلّور کے ساغر
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

بدی پر بارشِ لطف و کرم نیکی پہ تعزیریں
جوانی کے حسیں خوابوں کی ہیبت ناک تعبیریں
نکیلی تیز سنگینیں ہیں خوں آشام شمشیریں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

حکومت کے مظاہر جنگ کے پر ہول نقشے ہیں
کدالوں کے مقابل توپ، بندوقیں ہیں نیزے ہیں
سلاسل، تازیانے، بیڑیاں، پھانسی کے تختے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

افق پر جنگ کا خونیں ستارہ جگمگاتا ہے

ہر اک جھونکا ہوا کا موت کا پیغام لاتا ہے
گھٹا کی گھن گرج سے قلب گیتی کانپ جاتا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

فنا کے آہنی وحشت اثر قدموں کی آہٹ ہے
دھوئیں کی بدلیاں ہیں گولیوں کی سنسناہٹ ہے
اجل کے قہقہے ہیں زلزلوں کی گڑگڑاہٹ ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

اعتراف

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

میں نے مانا کہ تم اک پیکرِ رعنائی ہو

چمنِ دہر میں روحِ چمن آرائی ہو

طلعتِ مہر ہو، فردوس کی برنائی ہو

بنتِ مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو

مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے

میں نے خود اپنے کیے کی یہ سزا پائی ہے

خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے
شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
شہر خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے
خوابگاہوں میں لٹائی ہے جوانی میں نے

حسن نے جب بھی عنایت کی نظر ڈالی ہے
میرے پیمان محبت نے سپر ڈالی ہے

ان دنوں مجھ پہ قیامت کا جنوں طاری تھا
سر پہ سرشاری و عشرت کا جنوں طاری تھا
ماہ پاروں سے محبت کا جنوں طاری تھا
شہریاروں سے رقابت کا جنوں طاری تھا

بستر مخمل و سنجاب تھی دنیا میری
ایک رنگین و حسیں خواب تھی دنیا میری

جنت شوق تھی بیگانۂ آفات سموم
درد جب درد نہ ہو کاوش درماں معلوم
خاک تھے دیدۂ بیباک میں گردوں کے نجوم
بزم پروین تھی نگاہوں میں کنیزوں کا ہجوم

لیلیٰ ناز برافگندہ نقاب آتی تھی !
اپنی آنکھوں میں لئے دعوت خواب آتی تھی

سنگ کو گوہر نایاب وگراں جانا تھا
دشت پر خار کو فردوس جواں جانا تھا
ریگ کو سلسلۂ آب رواں جانا تھا
آہ یہ راز ابھی میں نے کہاں جانا تھا

میری ہر فتح میں ہے ایک ہزیمت پنہاں
ہر مسرت میں ہے راز غم وحسرت پنہاں

کیا سنو گی مری مجروح جوانی کی پکار
میری فریاد جگر دوز مرا نالۂ زار
شدّت کرب میں ڈوبی ہوی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار

وہ گداز دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں!
اب وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

میرے سائے سے ڈرو تم مری قربت سے ڈرو
اپنی جرأت کی قسم اب مری جرأت سے ڈرو
تم لطافت ہو اگر میری لطافت سے ڈرو
میرے وعدوں سے ڈرو میری محبت سے ڈرو

اب میں الطاف و عنایت کا سزاوار نہیں
میں وفادار نہیں، ہاں میں وفادار نہیں
اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

خوابِ سحر!

مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پر
رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پر

عقل کے میدان میں ظلمت کا ڈیرا ہی رہا
دل میں تاریکی دماغوں میں اندھیرا ہی رہا

اک نہ اک مذہب سعیٔ خام بھی ہوتی رہی
اہلِ دل پر بارشِ الہام بھی ہوتی رہی

اک نہ اک در پر جبین شوق گھستی ہی رہی
آدمیّت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی

رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگ زرگری جاری رہی

اہل باطن علم سے سینوں کو گرماتے رہے
جہل کے تاریک سائے ہاتھ پھیلاتے رہے

یہ مسلسل آفتیں، یہ یورشیں یہ قتل عام
آدمی کب تک رہے اوہام باطل کا غلام

ذہن انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں

کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

آسمانوں سے فرشتے بھی اترتے ہی رہے
نیک بندے بھی خدا کا کام کرتے ہی رہے
ابن مریم بھی اٹھے موسیٰ عمراں بھی اٹھے
رام و گوتم بھی اٹھے، فرعون و ہاماں بھی اٹھے
اہل سیف اٹھتے رہے اہل کتاب آتے رہے
ایں جناب اٹھتے رہے اور آنجناب آتے رہے
حکمراں دل پر رہے صدیوں تلک اصنام بھی
ابر رحمت بن کے چھایا دہر پر اسلام بھی
مسجدوں میں مولوی خطبے سناتے ہی رہے
مندروں میں برہمن اشلوک گاتے ہی رہے
آدمی منت کش ارباب عرفاں ہی رہا
درد انسانی مگر محروم درماں ہی رہا

غزل

تسکین دل محزوں نہ ہوئی وہ سعیٔ کرم فرما بھی گئے
اس سعیٔ کرم کو کیا کہئے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگیٔ وحشت کی قسم ۔ حیرت کی قسم حسرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں ہم راز تبسم پا بھی گئے

رو داد غم الفت ان سے ہم کیا کہتے کیوں کر کہتے
اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

ارباب جنوں پر فرقت میں اب کیا کہئے کیا کیا گذری
آئے تھے سواد الفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگ بہار عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اس محفل کیف و مستی میں اس انجمن عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

غزل

کچھ تجھ کو خبر ہے، ہم کیا کیا اے شورش دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوق نظارہ کیا کہیے، نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوق تصور کیا کیجے، ہم صورت جاناں بھول گئے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصل بہاراں رخصت ہو، ہم لطف بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے!
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے اب ان کی جفا کو کیا کہیے
اک نشتر زہر آگیں رکھ کر نزدیک رگ جاں بھول گئے

نئے ادب کے معمار

ادب کی تاریخ میں دس برس کی مدت ایک لمحے سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن اس ایک لمحے میں اردو ادب نے اپنا چولا بدل لیا ہے۔ مخالفتوں کے طوفان اٹھے نوجوان ادیبوں پر عریانی اور بداخلاقی کا الزام لگایا گیا ہے۔ حکومت، قانون، عدالتوں اور جیلوں نے ان کی راہ روکی لیکن ترقی پسند تحریک کا کارواں منزل بہ منزل آگے بڑھتا ہی گیا۔ اور آج مخالفین بھی یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ نوعمر شاعروں اور ادیبوں نے ہمارے ادبی خزانے میں بیش بہا اضافے کئے ہیں تکنیک اور موضوع دونوں اعتبار سے بے انتہا تنوع اور وسعت پیدا ہوگئی ہے اور کئی نئی اصناف ادب کا اضافہ ہوا ہے۔

ان بیباک اور صاحب طرز ادیبوں اور شاعروں کی حسین وجمیل تخلیقات سے سب ہی آشنا ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت اور زندگی سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

اس لئے "نئے ادب کے معمار" کے نام سے ہمارا ادارہ پچیس کتابوں کا ایک سٹ شائع کر رہا ہے جس میں اردو کے مقبول اور ہر دلعزیز ادیبوں اور شاعروں کی شخصیت زندگی اور ادب پر ان کے ہم عصروں کے لکھے ہوئے مقالے ہوں گے۔

سرورق پر تصویر اور ہر کتاب میں ایک چھوٹا سا انتخاب بھی شامل ہے ان کتابوں کی اشاعت جنوری ۱۹۴۷ء سے شروع ہوگی اور دسمبر ۱۹۴۸ء تک ختم ہو جائے گی۔ یہ سلسلہ صرف پچیس کتابوں تک محدود نہیں ہوگا بلکہ ہم اس میں ہر سال اضافہ کرتے رہیں گے

نئے ادب کے معمار

افسانہ نگار

۱ سجّاد ظہیر از ڈاکٹر محمد اشرف

۲ کرشن چندر از خواجہ احمد عباس

۳ عصمت چغتائی از سعادت حسن منٹو

۴ سعادت حسن منٹو از کرشن چندر

۵ اختر رائے پوری از دیوندر ستیارتھی

۶ راجندر سنگھ بیدی از کنھیّا لال کپور

۷ اوپندر ناتھ اشک از راجندر سنگھ بیدی

۸ احمد عباس از عصمت چغتائی

۹ اختر اورینوی از سہیل عظیم آبادی

۱۰ دیوندر ستیارتھی از ساحر لدھیانوی

۱۱ ممتاز مفتی از ن۔ م۔ راشد

نئے ادب کے معمار

شاعر

۱۲	فراق گورکھپوری	از	مجنوں گورکھپوری
۱۳	اسرار الحق مجاز	از	عصمت چغتائی
۱۴	فیض احمد فیض	از	پطرس
۱۵	ن ۔ م ۔ راشد	از	؟
۱۶	مخدوم محی الدین	از	سردار جعفری
۱۷	سردار جعفری	از	کرشن چندر
۱۸	احمد ندیم قاسمی	از	ساحر لدھیانوی
۱۹	معین احسن جذبی	از	اسرار الحق مجاز
۲۰	جان نثار اختر	از	سبط حسن
۲۱	کیفی اعظمی	از	سجاد ظہیر
۲۲	ساحر لدھیانوی	از	کیفی اعظمی

سائز ۲۰ × ۳۰ / ۱۶ ضخامت ۶۴ صفحے قیمت فی کتاب پندرہ آنے

نئے ادب کے معمار

(۲۳)

شاعر انقلاب

از

ممتاز حسین   علی سردار جعفری

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کے سوانح حیات زندگی اور شاعری کے مختلف دوروں پر سیر حاصل تبصرہ۔ موجودہ دور کے سب سے بڑے شاعر پر یہ پہلی کتاب ہے جس میں پچاس صفحے کا انتخاب بھی شامل ہوگا۔ صاحبان ذوق کے لئے بہترین تحفہ۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ضخامت ۲۲۵ صفحے قیمت تین روپیہ

(۲۴)

پریم چند

از

سجاد ظہیر

اردو کے پہلے عظیم المرتبت افسانہ نگار کی زندگی اور شخصیت پر پہلی کتاب کتاب میں متعدد تصاویر کے علاوہ پچاس صفحے کا انتخاب بھی شامل ہوگا۔

سائز $\frac{30 \times 20}{16}$ ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت ڈھائی روپے

(۲۵)

تین شاعر

اختر شیرانی۔ حفیظ جالندھری اور ساغر نظامی۔ ترقی پسند تحریک کے پیش رو ہیں۔ ان کی شخصیت اور زندگی پر تین مقالے۔ تصاویر کے علاوہ ایک اچھا انتخاب بھی شامل ہے۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت ڈھائی روپے